سنسکرت میں تقسیم مخارج کے ساتھ حروف کے حرکات کی تقسیم بھی شامل ہے جن کو بمنزلہ اصوات سمجھنا چاہیئے اور اُن کو سُور **स्वर** کہتے ہیں اور اُس کی تین قسمیں ہیں۔ ہرسو **ह्रस्व** دیرگھ **दीर्घ** پلت **प्लुत** ہرسو جس کے ادا میں ایک ماترا ٹھہراؤ اور دیرگھ جس میں دو ماترا وقفہ ہو اور پلت جس کے ادا میں تین ماترا ٹھہراؤ ہو (ماترا = آن) ان میں سے ہر ایک کی تین قسمیں ہیں

(۱) اودات **उदात्त** (۲) انوادت **अनुदात्त** (۳) سورت **स्वरित**

ان میں سے جو اونچے سر سے ادا کیا جائے اُس کو اودات کہتے ہیں اور جو نیچے سُر سے ادا کیا جائے وہ انوادت ہے۔ ان دونوں میں متوسط حالت رکھنے والا سورت ہے۔ پہلی تین قسموں کو اس تین قسموں میں ضرب دینے سے نو اقسام حاصل ہوتی ہیں پھر ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں۔ انوناسک **अनुनासिक** غنہ دوسرے ان نوناسک **अननुनासिक** غیر غنہ۔ ان نو قسموں کو اُن دو قسموں میں ضرب دینے سے اٹھارہ قسمیں حاصل ہوتی ہیں۔ جیسا کہ زبان سنسکرت کے مشہور نحوی پانی نے اشٹھ ادھیائے میں لکھا ہے (ادھیائے ۱-۲-۲۷)

ऊकालोऽज्झ्रस्वदीर्घप्लुतः ۱-۲-۲۷ ترجمہ: اوکے تلفظ کے مدت میں حرکات کی تین قسمیں ہیں۔ ہرسو۔ دیرگھ۔ پلت۔

उच्चैरुदात्तः ۱-۲-۲۹ (ترجمہ: اونچے سُر والا اودات ہے) **नीचैरनुदात्तः** ۱-۲-۳۰

(ترجمہ: نیچے سُر والا انودات ہے) **समाहारः स्वरितः** ۱-۲-۳۱

(ترجمہ: اوسط مرتبہ میں سورت ہے) اس تفصیل کے بعد پھر مخارج کی تفصیل آتی ہے
مخارج کی بھی دو قسمیں ہیں ایک مفرد دوسرا مرکب۔ ان میں سے اکثر دونوں عربی
وسنسکرت میں مشترک ہیں منجملہ اُن کے جو سنسکرت میں مخصوص ہیں سَرھی ایک
مخرج ہے۔ یعنی ہوا بلند ہو کر سر سے ٹکر کھاتی ہے تو وہ حروف پیدا ہوتے ہیں
جن کا مخرج سر ہے جیسا کہ نحو میں سنسکرت نے لکھا ہے۔

ऋटुरषाणां मूर्द्धा (ترجمہ: ر۔ ڑ۔ ڑھ۔ ٹ۔ ٹھ۔ ڈ۔ ڈھ۔
ڑن (بنون غنہ) ر اور ش کا مخرج سر ہے۔ بقیہ مخارج تقریباً مشترک ہیں۔ اگرچہ
مرکب مخارج کے اضافہ سے مخارج کی مجموعی تعداد بڑھ گئی۔ اصوات حروف کے
ملانے سے حقیقت فصاحت پر کافی روشنی پڑتی ہے سنسکرت میں مخارج کا تناسب
بھی ملحوظ ہوتا ہے جو فصاحت الفاظ میں ممد و معاون ہے۔ عربی میں عام طور پر
اصوات حروف اور اُس کے انواع سے بحث نہیں ہوتی ورنہ اس سے فصاحت
کی حقیقت صاف اور مبرہن ہوتی۔

ابن سنان نے لکھا ہے کہ الفاظ کے ثقل وخفت کا دارومدار مخارج کے قرب
وبعد پر ہے جس لفظ کی ترکیب ایسے حروف سے ہو جن کے مخارج باخود ہا قریب ہوں
اُس میں ثقل ہوگا اور وہ لفظ زبان پر بھاری اور کانوں کو گراں معلوم ہوگی اور
جس قدر مخارج میں بعد ہوتا جائے گا اُسی قدر لفظ خفیف اور ہلکا ہوتا جائے گا
اکثر مصنفین نے اس رائے کی تائید کی ہے لیکن امیر یحیی بن حمزہ بن علی بن

ابراہیم علوی یمنی د ۶۶۹ھ ۱۲۷۰ء جس نے علم حقیقت اعجاز پر کتاب الطراز لکھی ہے ابن سنان سے اس امر میں اختلاف کرتا ہے اور اس موضوع پر اس نے مفصل بحث کی ہے جس کا اقتباس میں یہاں نقل کرتا ہوں :

حروف کی آواز کے مدارج ہیں اور اُن کے اعتبار سے مفردات حروف کی مختلف حالتیں ہیں بعض حروف کی آواز خوش آیند ہوتی ہے اور بعض حروف کی آواز کریہ اور ناگوار ہوتی ہے لیکن حقیقتاً کراہیت اور عدم کراہیت کا تعلق اُن کے باخودہا ترکیب سے پیدا ہوتا ہے بعض حروف باخودہا ترکیب پانے سے زبان پر ثقیل ہوجاتے ہیں اور بعض میں شیرینی پیدا ہوتی ہے ان کا دارو مدار کلیتہً ترکیب حروف پر ہے چنانچہ کلام عرب میں دیکھا گیا ہے کہ واضع لغت نے حا اور عین، خا اور غین، جیم و صاد، جیم و قاف، ذال و زا، (معجمہ) کو ایک لفظ میں جمع نہیں کیا ہے۔ ان حروف کے باخودہا ترکیب سے جو لفظ حاصل ہوتا ہے وہ زبان پر ثقیل اور کانوں کو ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ اس کو مخرج کے قرب و بعد میں کوئی دخل نہیں ہے۔ جیسا کہ ابن سنان وغیرہ کا خیال ہے کہ الفاظ کی خوبی و بدی اُن کے حروف کے قرب و بعد مخارج پر مبنی ہے اگر قریب المخارج حروف کسی لفظ میں یکجا مجتمع ہوں تو لفظ میں ثقل پیدا ہوتا ہے اور مخارج کی دوری سے لفظ خفیف اور زبان پر رواں ہوتا ہے اور تلفظ میں حسن پیدا ہوتا ہے بالکل غلط ہے بہت سے ایسے الفاظ ہیں جن کے حروف بعید المخارج ہیں لیکن پھر بھی وہ کریہ سمجھے

جاتے ہیں۔ مثلاً ملع یہ میم و لام و عین سے مُرکّب ہی جس میں میم کا مخرج ہونٹ ہے اور لام کا مخرج وسط زبان اور عین کا مخرج حلق ہے ان میں با خود ہا بعد ہے لیکن اس میں یہ لفظ کریہ سمجھا جاتا ہی اور فصحا اس کو استعمال نہیں کرتے بعض فصیح الفاظ ایسے بھی ہیں جن کے حروف با خود ہا قریب المخارج ہیں جو باعث ثقالت سمجھا جاتا ہے لیکن پھر بھی فصیح ہیں۔ مثلاً ذقتہ بفمی۔ یہاں با، فا، میم ہر ایک قریب المخرج ہیں سب ہونٹھ سے ادا ہوتے ہیں لیکن یہ فصیح ہے۔ لہذا یہ خیال غلط ہی۔ قرب و بعد مخارج کو حقیقتاً فصاحت میں کوئی دخل نہیں ہی۔ اس کا تعلق جہاں تک ہی وہ محض ذوق سلیم اور طبع مستقیم پر مبنی ہی۔ بہت سے ایسے الفاظ ہیں کہ اُن کی ترتیب و نظم حروف بدل دیجئے تو اگر لفظ فصیح ہے تو غیر فصیح یعنی کریہ ہو جاتا ہی اور اگر کریہ ہے تو فصیح ہو جاتا ہے مثلاً ملع غیر فصیح ہے اگر اس کو علم بنا دیجئے تو فصیح ہو جاتا ہی۔ حالانکہ حروف یکساں ہیں تفحص و استقرا سے معلوم ہوتا ہی کہ الفاظ کی فصاحت کو ان چیزوں سے تعلق اور واسطہ نہیں ہے بلکہ الفاظ کے چند خواص ہیں کہ جب وہ کسی لفظ میں پائے جاتے ہیں تو لفظ فصیح سمجھا جاتا ہی گویا الفاظ کے یہ قدرتی حالات ہیں جن سے الفاظ فصیح و غیر فصیح ہوتے ہیں۔ وہ خواص یہ ہیں: اوّل یہ کہ لفظ مانوس ہو۔ اہلِ زبان اپنے محاورات میں اُس کو بکثرت استعمال کرتے ہوں زبانوں پر وہ الفاظ کثرت استعمال سے رواں ہو گئے ہوں۔ اُن کی بناوٹ میں کوئی غرابت یا خلاف قاعدگی نہو! وضاع

لغوی سے خارج نہ ہو (جیسے لفظ آسمان کہہ کر زمین مراد لیں) دوسرا خاصہ یہ ہے کہ لفظ زبان پر آسانی سے جاری ہو۔ سُننے میں خوش آیند ہو چنانچہ قرآن کریم میں یہ خاص بات ہے کہ تمام الفاظ اُس کے زبان پر بہت رواں ہیں۔ الفاظ میں بھونڈا پن نہیں ہے جیسے لفظ حجیش یا اطلخمّ یا جفخت جیسا کہ متنبی نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے کہ جَفَخَتْ وَهُمْ لَا يَجْفَخُونَ بِهَا بِهِمْ (ترجمہ: اُس نے اُن پر فخر کیا اور وہ لوگ اُس پر فخر نہیں کرتے) یہ الفاظ کریہہ اور غیر فصیح سمجھے جاتے ہیں تیسرا خاصہ۔ لفظ مالوف الاستعمال ہو بحیثیت لفظ سہل ہو اور بلحاظ معنی دل میں چبھنے والا ہو۔ چوتھا خاصہ سختی اور نرمی میں یکساں ہو۔ سختی سے یہ مراد نہیں ہے کہ لفظ بھونڈا ہو بلکہ غصہ، ہیبت اور تہدید کے مواقع پر جس قسم کا لفظ استعمال کیا جائے اور اُس کیفیت کے اظہار کے لئے لفظ اُتنا ہی زوردار ہو الف و محبت کے اظہار کے لئے اُسی درجہ کا نرم لفظ ہو تاکہ دونوں حالتوں میں الفاظ کے اوزان برابر رہیں یہ نہ ہو کہ موقع غضب اور تہدید میں الفاظ کا زور زیادہ ہو لیکن اظہار محبّت اور پیار میں الفاظ کی نرمی کم ہو۔ نہیں بلکہ نرمی اور غضب کے الفاظ اپنی اپنی جگہ پر نرمی اور سختی میں تلے ہوئے ہوں جیسا کہ اللہ تعالیٰ ہنگامۂ محشر کی حالت بیان فرماتا ہے۔ ونفخ فی الصور فصعق من فی السمٰوٰت ومن فی الارض نفخ فی الصور کے بعد لفظ صعق نے کلام کو بہت زوردار کر دیا اس لئے صعق نہایت فصیح ہے یا رافت اور ملاطفت کو یوں ظاہر فرماتا ہے۔ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجٰى

مَاوَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی یہاں قَلٰی کی نرمی اور وہاں صعق کی جزالت ایک ہی پیمانہ پر ہے نہ یہاں کمی ہے اور نہ وہاں زیادتی۔

میرے نزدیک ابن سنان نے فصاحت لفظ کو کسی اصول وقاعدہ کے اندر لانے کی کوشش کی ہے اور اُس کے لحاظ سے قواعد مرتب کئے ہیں لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ فصاحت الفاظ کا معیار انسان کے ذوق فطری اور سلامت طبع کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ ابوبکر خطیب دمشق وعلامہ تفتازانی وغیرہم بہت سی جانفشانی اور کوششوں کے بعد اسی نقطہ پر پہنچے ہیں۔ امیر المومنین یحی بن حمزہ العلوی الیمنی نے جو کچھ لکھا ہے اُنھیں تحقیقات کی تشریح ہے۔

الفاظ کے بعد معانی کا مرتبہ ہے جن کے قالب الفاظ ہیں۔ کسی شے کا قالب اگر اچھا نہ ہو تو وہ اصل شے بھی بھونڈی نظر آئے گی یا شے خراب ہے لیکن قالب اچھا ہے تب بھی شے بحیثیت مجموعی اچھی نہ ہوگی حقیقت میں لفظ ومعنی کا تعلق عجیب وغریب تعلق ہے اگر اس پر نظر عمیق ڈالی جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ موجودات ذہنیہ کا مرتبہ پہلے ہے اور وجود الفاظ اُس کے بعد ہے۔

موجودات عالم پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو اُن کی تحقق اور وجود کے چار مراتب ذہن میں آتے ہیں ایک تو وہ اشیاء ہیں جن کا وجود محض ذہنی ہے یہی اشیاء کے وجود اور تحقق کا اصلی مرتبہ ہے جن سے دوسرے موجودات پیدا ہوتے ہیں جب تک کسی شے کا تصور یا تحقق ذہن میں نہ ہوگا اُس کا وجود خارج میں بھی نہیں ہو سکتا

بعض تصورات ذہنیہ ایسے ہیں جن کا وجود خارج میں نہ تو کبھی ہوا ہے اور نہ ہوگا مثلاً قدرت قدیمہ یا حیات قدیمہ یہ موجودات ذہنیہ ایسے ہیں جن کا وجود خارج میں نہ تو کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ بخلاف اس کے بعض تصورات ذہنیہ ایسے ہیں جن کا وجود خارج میں بھی ہے جیسے آگ، پانی، شیر، پتھر وغیرہ۔

دوسرے وہ اشیاء جن کا وجود خارج میں ہے اور وہ عالم میں اپنا مستقل وجود رکھتی ہیں اور وجود ذہنی سے الگ ہو کر عالم میں موجود ہیں اعم اس سے کہ اُن کا ادراک ہم کر سکتے ہوں یا نہ کر سکتے ہوں۔ تیسری مرتبہ پر وہ الفاظ ہیں جو ان صور و اشکال خارجیہ اور ذہنیہ پر دلالت کرتے ہیں اس مرتبۂ وجود میں صرف الفاظ ہیں جن کو واضع نے اپنی مصلحت مخصوصہ سے اس طرح پر وضع کیا ہے کہ جب وہ لفظ بولا جاتا ہے تو وہی صورت خواہ ذہنی ہو یا خارجی سمجھ میں آتی ہے جس کے لئے واضع نے اُس لفظ کو وضع کیا ہے۔ چوتھا مرتبہ حروف کا ہے جن سے وہ الفاظ بشکل خاص لکھنے میں آتے ہیں۔ پہلے دونوں مراتب کسی وضع و اصطلاح کے محتاج نہیں۔ اُن کا تعلق معقولات ذہنیہ سے ہے جن کے لئے الفاظ و عبارت کی حاجت نہیں ہے۔ لیکن اخیر کے یہ دونوں مراتب وضع اور اصطلاح کے محتاج ہیں اور ان میں باعتبار اصطلاحات مختلفہ لسانی کے تصرفات گوناگوں ہوتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے انسان میں لوح (پلیٹ) عقل کو فوٹوگرافی کے پلیٹ کی صورت میں رکھا ہے جس پر حواس خمسہ کے دروازہ یعنی لینس ((Lens)) کے ذریعہ سے اُو

نیز دیگر ذرائع مخفیہ سے چیزوں کی تصویر چھپ جاتی ہے اس لئے ہر شے کے دو
وجود قرار پائے ایک وجود ذہنی دوسرے خارجی۔ وجود ذہنی یا عقلی چیزوں
کی وہ تصویر ہے جو عقل میں مرتسم ہوئی اور اسی کو علم بھی کہتے ہیں۔ چونکہ انسان
مدنی الطبع ہے۔ اپنی زندگی بسر کرنے میں ایک جماعت و گروہ انسانی کا محتاج ہے
تاکہ معیشت میں اپنے معلومات و محسوسات کو دوسرے پر ظاہر کرکے اُس سے مدد
لے۔ چونکہ انسانی استمداد و استعانت کا دائرہ بہت وسیع ہے کبھی تو وہ موجود اور
حاضر سے مدد لیتا ہے اور کبھی وہ مجبور ہوتا ہے کہ ایسے اشخاص سے مدد لے جو موجود
نہیں ہیں اس حاجت نے انسان کو مجبور کیا کہ پہلے وہ اصوات مختلفہ کی ترکیب و
امتزاج سے الفاظ بنائے جس کے ذریعہ سے بایک دگر امداد و استمداد و اظہار
مدعا کرسکے چونکہ اصوات فانی غیر قار اشیاء میں سے ہیں وہ دیر تک قایم نہیں
رہ سکتیں اور نہ ایک محل سے دوسرے محل تک جاسکتی ہیں اس لئے حاجت نے کتابت
کے ایجاد پر مجبور کیا۔ کتابت نقوش ہیں جو الفاظ کے قایم مقام ہیں اُن کی دلالت
عبارات پر اُسی طرح سے ہے جیسا کہ الفاظ کی دلالت صور ذہنیہ پر اور صور ذہنیہ کی
دلالت صور خارجیہ پر اس تقریر سے واضح ہوا کہ جس طرح الفاظ اور جملے جبکہ ترکیب
میں واقع ہوں مرجع بلاغت ہیں اسی طرح خطوط اور نقوش بھی مرجع بلاغت سمجھے جاتے
ہیں اور محل صنائع ہیں۔ جیسے بے نقط۔ صنعت رقطاء صنعت خیفاء وغیرہ وغیرہ
جاننا چاہیئے کہ بلاغت تنہا اور مفرد لفظ کی صفت نہیں جس طرح انسان جسم

جسم میں کسی عضو کا نام نہیں ہی بلکہ مجموعہ جسم و روح مصداق لفظ انسان ہی۔ اسی طرح بلاغت کا مصداق الفاظ کا ایک سلسلہ ہے جو مدعائے قائل کو اُسی کمیت اور کیفیت سے ظاہر کرتا ہی جس کا ارادہ قایل نے کیا ہے۔ چونکہ ادائے مطلب کا ذریعہ الفاظ ہیں اس لئے وجود بلاغت میں الفاظ کا لحاظ بھی لزوماً بڑا حصتہ رکھا ہی۔ اگر الفاظ کی حالت خراب ہو تو فہم مدعائے قائل میں مختلف قسم کی خرابیاں لاحق ہوں گی اس کی تفصیل و تحقیق حسب ذیل ہی۔

بلاغت لفظ سے تعلق رکھتی ہے یا معنی سے؟

ہر شخص کو تقریباً یہ اتفاق اکثر پیش آتا ہے کہ بعض کلام کا اُس کے قلب پر خاص اثر ہوتا ہی اور بعض کلام ایسے بھی کانوں میں پڑتے ہیں جن سے تنغص پیدا ہوتا ہے یا کم سے کم اُس کا کوئی خاص اثر سننے والے پر مترتّب نہیں ہوتا جن میں بدیہی طور پر امتیاز ہوتا ہی کہ اُن میں سے ایک بہتر ہی اور دوسرا بدتر۔ ایک کو دوسرے پر فضیلت ہے اگر ہم اس فرق اور مدارج کلام پر غور کریں تو ہمارے سامنے جو مشکل ترین سوال پیش ہوتا ہی وہ یہ ہی کہ ان دونوں کلاموں میں جو تفاوت ہی اُن کا منشا الفاظ ہیں یا اُن کے معانی اگر ہم اپنی اس تحقیقات کے فکر میں اُس جملہ کا تجزیہ کریں اور اُن کے اجزاء ترکیبی پر غور کریں تو ہم کو فقط الفاظ کا ایک سلسلہ ملے گا جو باد خود باجملہ میں ایک لڑی کی صورت میں پرویا ہوا نظر آئے گا جن کی ترتیب سے مدعائے قائل سمجھ میں آتا ہی۔ اگر اُن الفاظ کو الگ الگ کر دو اس طرح پر کہ وہ

نظم و ترتیب باقی نہ رہی اور ان دونوں کلام کے ہر ہر لفظ الگ الگ جانچے اور پرکھے جائیں تو اُن میں کسی کو دوسرے پر فضیلت نظر نہ آئے گی مثلاً اسد اور لیث دو لفظیں ہیں جو شیر کے لئے موضوع ہیں کوئی شخص یہ کہ سکتا ہی کہ اُن میں سے ایک سے شیر کے معنی زیادہ سمجھ میں آتے ہیں باعتبار دوسرے کے ؟ یا دو مختلف زبانوں کے ہم معنی الفاظ کو دیکھیں جیسے شیر اور باگھ وہ شخص جو ان کے اوضاع سے واقف ہی ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ذات جس کے لئے شیر کا لفظ موضوع ہی اُس سے شیر کا مفہوم باگھ کے لفظ سے زیادہ سمجھا جاتا ہی کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ باگھ کا لفظ لفظ شیر سے زیادہ تر مرغوب ہی ؟ دونوں اپنے محل پر شیریں اور مرغوب ہیں۔

بلاغت کا تعلق مجموعۂ لفظ و معنی سے ہے

اجزائے کلام کی تحلیل سے یہ امر واضح ہوتا ہی کہ ایک کلام کی خوبی اور ایک کلام کی فضیلت دوسرے پر الفاظ کی وجہ سے نہیں ہی بلکہ معانی کے لحاظ سے ترتیب الفاظ کی خوبی ہی کسی فصیح جملہ سے اُس کے الفاظ کو جُدا کرکے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ لفظ فصیح یا یہ کریہہ بلکہ معانی اور اُن کی باخود با ترتیب اور حُسن ادا یہی جادو ہے جو مسحور کرلیتا ہی جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہی۔ یَا اَرْضُ ابْلَعِی مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ اَقْلِعِی وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِىَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِىِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ یہ کلام اُس حد پر جا پہنچا ہی جو انسانی دسترس سے بہت پرے ہی ہر لفظ کو لیجئے

مثلاً یا، اَرض، اُبلِی، مار، سَمار، غیض، استوی وغیرہ وغیرہ ہر زبان داں
ان الفاظ کو رات و دن اپنے محاورات میں لاتا ہی لوگ روزمرّہ لکھتے اور
بولتے ہیں ان میں سے کسی خاص لفظ کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حد اعجاز
میں ہی یا غیر معمولی ہی اس میں جو کچھ کرشمہ اور سحر ہے وہ ترکیب ہے یہی جڑی
بوٹیاں اور یہی گھاس پتّے ہیں جن کو ہر شخص جانتا ہے مگر کیمیا گر اس سے
ایسے ایسے کرشمے دکھلاتا ہے کہ عقل متحیّر ہوتی ہے۔ یہ صرف ان کے
اوزان اور ترکیب کی کرامات ہی۔ اسی طرح خداوند کریم نے انھیں الفاظ کا ایسے
وزن و ترتیب سے پیوند ملایا ہے کہ جس کو سُن کر روح بے چین ہو جاتی ہی اس سے
صاف طور پر واضح ہو گیا (اور شک کی گنجایش باقی نہیں رہی) کہ الفاظ بحیثیت
الفاظ کے جب اُن کو ترکیب اور ترتیب سے الگ کر دو تو ایک کو دوسرے پر
کوئی فضیلت نہیں ہی۔ ایک ہی مضمون ہی ایک شخص اُس کو اپنی عبارت اور
ترکیب میں ادا کرتا ہے تو اس کا قلب پر خاص اثر ہوتا ہی اور اُسی کو دوسرا شخص
اپنی عبارت میں ادا کرتا ہی تو اُس سے نفرت اور وحشت ہوتی ہی۔ یہی لفظ
اور کلمات ہیں ایک شخص کی ترکیب دینے سے کتنا مرتفع ہوتا ہی اور دوسرے
شخص کی ترکیب سے کس قدر پست ہو جاتا ہی اگر اس کا مدار الفاظ پر ہوتا اور ان کی
خوبصورتی سے کلام خوبصورت اور خوشنما ہوتا تو وہی الفاظ ہر جگہ یہی کیفیت
اور فضیلت پیدا کرتے حالانکہ ایسا نہیں ہی۔ بلکہ اگر کسی بلیغ کلام کا نمونہ پیش کیا

کیا جائے تو سُننے والے کے لئے دشوار ہوگا کہ ویسا ہی کلام خود بھی کہہ سکے اس لئے کہ اُس کا ذہن اُس نظم و ترتیب سے خالی ہے اگرچہ الفاظ اور کلمات کا ذخیرہ اُس کے پاس بھی موجود ہے۔

فرق درمیان نظم حروف و نظم کلام

اس موقع پر ترتیب حروف جن سے الفاظ حاصل ہوتے ہیں اور ترتیب کلمات جن سے کلام بنتے ہیں ان کے درمیان میں فرق و تمیز ضروری ہے۔ الفاظ حقیقتاً زبان کے ذریعہ سے حروف تہجّی کو بہ ترتیب ادا کرتے ہیں۔ یہ ترتیب حروف کسی مفہوم کے ادا کے لئے نہیں ہے جس میں حروف کا ترتیب دینے والا اپنی عقل سے مدد لے اور کچھ سوچ سمجھ کر اس ترکیب کو قایم کرے۔ بلکہ اس ترتیب کا تعلق لغت بنانے والے کی ذات سے ہے۔ واضع لغت نے جس لفظ کو جس طرح وضع کر دیا وہی اُس کی صورت ہے اور اُس سے وہی معنی مراد ہوں گے جس کے لئے وہ وضع کیا گیا ہے۔ مثلاً لفظ شیر یا اسد اگر بجائے ان کے ریش (مقلوب شیر) یا دسا (مقلوب اسد) وضع کئے جاتے تب بھی وہی معنی حاصل ہوتے جو اب ان حروف کو اس خاص ترتیب پر رکھنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ حروف کی ترتیب سے جو لفظ بنتا ہے اُس کا تعلق واضع لغت سے ہے معانی اور مفاہیم کو اس میں دخل نہیں ہے اور نہ اس لفظ کے استعمال کرنے والے کو اُن حروف کی ترتیب اور صورت سے بحث ہوتی ہے۔ بخلاف اس نظم و ترتیب الفاظ کے جن سے جملے بنتے ہیں جن سے قائل کا کوئی مافی الضمیر ظاہر ہوتا ہے۔

اس ترتیب الفاظ میں ایک لفظ کا دوسرے لفظ سے علاقہ اور ربط ملحوظ ہوتا ہی
اس کو یوں سمجھنا چاہیئے جیسے کپڑا بننے والا دو دھاگوں کو اُس نہج پر ملاتا ہے
جو پیشتر سے اُس کے ذہن میں موجود ہی یا معمار اینٹ کو بایکدگر اس طرح پیوند دیتا
ہی جس طرح پر اُس کو ہونا چاہیئے۔ اگر پہلی مثال میں ایک دھاگے کو اُس محل سے
جو اُس کی جگہ قرار پائی ہے ہٹا دیں تو اس شکل اور صورت میں فرق آجائے گا
جس کے لئے اُس نے اُس ترتیب کو قایم کیا تھا۔ اسی طرح دوسری مثال کو بھی
ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ اگر کوئی اینٹ (جو اپنے محل پر قایم ہے اور معمار نے اُس کے
لئے وہی محل مناسب اختیار کیا ہی) ہٹا دی جائے تو وہ صورت بالکل بطل ہو جائیگی
اس فرق کے سمجھنے کے بعد یہ امر یقیناً بخوبی ذہن نشین ہو جائے گا کہ نظم کلام کا
مدعا صرف یہی نہیں ہی کہ آپ چند الفاظ کو ترتیب دے کر اُن کو زبان سے ادا
کیجئے بلکہ الفاظ کی ترتیب جملہ میں اس طرح واقع ہو کہ اُس سے وہ مدعا صاف طور
پر سمجھ میں آجائے جو کہنے والے کے ذہن میں ہے جس کے لئے اُس نے ان الفاظ
کو اس ترتیب خاص پر رکھا ہی۔ ہر لفظ کو دوسرے سے ایسا ربط ہونا چاہیئے جس سے
وہ مدعا جو ذہن میں ہے اُسی کیفیت کے ساتھ سامع پر آشکارا ہو جائے جس سے قائل
متکیف ہی اور وہ ترتیب الفاظ اُسی مدعا پر دلالت کرے جو مقصود ہے۔ اس قدر
ذہن نشین ہونے کے بعد متاخرین نے ردّ و قدح اور تحقیقات کر کے جو بلاغت کی
تعریف کی ہی وہ صاف طریقہ سے سمجھ میں آسکتی ہی۔ افسوس ہے کہ بعض خرمن

یورپ کے کورانہ خوشہ چینیوں نے اپنی لاعلمی سے اس تعریف کو بھی ناقص ٹھیرایا ہے مگر جس قدر یہ دعویٰ مُہتم بالشان تھا اُس کے مقابلہ میں ایک پھس پھسی دلیل بھی نہ لاسکے۔

بلاغت کی تعریف | بلاغت کی تعریف مختلف لوگوں نے مختلف الفاظ میں کی ہے کسی نے بلاغت کی حقیقت یوں بیان کی ہے کہ "اختصار اس حد میں کہ مدّعا فوت نہ ہو اور طول صرف اتنا کہ انسان گھبرا نہ جائے" کسی نے ایک اعرابی سے پوچھا کہ کون شخص زیادہ بلیغ ہے اُس نے جواب دیا "جس کے الفاظ آسان ہوں اور سننے میں بھلے معلوم ہوں" خلیل ابن احمد کا قول ہے کہ "بلاغت وہ ہے جس کے ایک ہی لفظ کے سننے سے کل مضمون ظاہر ہو جائے" بعض کا قول ہے کہ بلاغت خوبی عبارت ہے جس سے صحیح طریقہ سے کہنے والے کا مدعا معلوم ہو جائے۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ بلاغت کلام کا اس نہج سے واقع ہونا کہ اوّل کلام سے آخر کلام کا پتہ چلے اور آخر کو اوّل سے ربط ہو۔ جلال الدین قزوینی خطیب دمشق نے لکھا ہے کہ بلاغت کلام یہ ہے کہ کلام مقتضائے حال کے مطابق ہو اور اُس کے الفاظ فصیح ہوں۔ مقتضائے حال ایسا وسیع جملہ ہے جس کا مفہوم بہت عام ہے۔ اُس کا منشا یہ ہے کہ متکلم اپنے کلام میں اُن تمام خصوصیات کا لحاظ رکھے جو ادائے مقصد میں کام آویں۔ مثلاً ایک شخص جدہ میں تار گھر ہونے کا منکر ہے۔ اگر اُس سے صرف اتنا کہا جائے کہ جدہ میں تار گھر ہے تو یہ کلام مناسب حال نہ ہوگا اس لئے کہ منکر سے گفتگو کرنے میں کلام کو زور

دار ہونا چاہیئے اور اُس کی بھی مختلف حالتیں ہیں جس قدر مخاطب کا انکار شدید ہو اُسی قدر تاکید کو قوی ہونا چاہیئے۔ کوی محل کلام یہ چاہتا ہی کہ اس جگہ فاعل کو ذکر نہ کریں وہاں اُس کا ذکر مخل بلاغت ہی یا کوئی شخص کسی واقعہ کو نہیں جانتا اور اس سے وہ خالی الذہن ہی اُس سے گفتگو میں اگر تاکید لائی جائے تو یہ خلاف بلاغت ہی اس لیئے کہ یہ موقع کلام کو زور دار کرنے کا ہی۔ چونکہ مقتضیات احوال مختلف ہیں اُسی لحاظ سے مقامات کلام بھی لزوماً مختلف ہوں گے جہاں کلام کو طول دینے کی حاجت ہوتی ہے وہاں کلام مختصر کرنے سے کلام پست ہو جاتا ہی مثلاً ایک شخص محبوب سے گفتگو کر رہا ہے لیکن وہ دو باتیں کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے تو یہ خلاف اقتضائے مقام ہی۔ یہاں موقع کلام یہ چاہتا ہی کہ کلام کو طول دیا جائے اس لئے جس قدر کلام طویل ہوگا اُسی قدر سلسلۂ کلام محبوب کے دراز ہوگا جو باعث لذت قلب عاشق ہی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہی: وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ (یہ ایک موقع ہی کہ اللہ تعالیٰ موسیٰؑ سے پوچھتا ہی کہ "اے موسیٰ تیرے داہنے ہاتھ میں کیا ہی؟ حضرت موسیٰؑ جواب دیتے ہیں "میری چھڑی ہے۔ میں اس پر ٹیکتا ہوں اس سے اپنی بکری ہانکتا ہوں اور اس سے اور بھی میرے کام نکلتے ہیں") سوال تو صرف یہ تھا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہی۔ اس کا جواب صرف یہی ہو سکتا تھا کہ چھڑی۔ اس لئے کہ خدا نے اُس چھڑی کی نسبت پوچھا تھا کہ یہ کیا ہی؟ چھڑی کے فوائد اور اُس کے منافع کا

سوال ہی نہ تھا حضرت موسیٰ نے جواب میں فوائد و منافع عصا کو شامل کر کے بظاہر غیر متعلق بات کہی مگر مدعا یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ سے سلسلۂ کلام دراز ہو اور اس سے گفتگو کی لذت دیر تک قائم رہے۔ یہ موقع کلام کو طول دینے کا تھا اگر بجائے اس کے کلام مختصر ہوتا اور موسیٰؑ صرف چھڑی کہہ کر خاموش ہو جاتے تو اس لذت کو کھو دیتے۔ کلام پایۂ بلاغت سے گر جاتا اور بیان کی یہ دل آویزی باقی نہ رہتی لیکن اسی کے ساتھ طول کلام کے مدارج بھی مختلف ہیں جس کا انحصار قائل کی قوت ممیزہ پر ہے۔ یعنی یہ امتیاز کہ طول کس حد تک ہونا چاہیئے موقع اور محل اور حالت مخاطب کے لحاظ سے خود سمجھ میں آتا ہے۔ اس کے لئے کوئی کلیہ قاعدہ نہیں ہو سکتا۔ بعض نابکار یہاں بھی قاعدہ ڈھونڈھتے ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب نے بڑے شد و مد سے متقدمین و متاخرین پر یہی دور از کار اعتراض کیا ہے کہ اُن لوگوں نے سب کچھ لکھا لیکن یہ نہیں لکھا کہ کہاں پر کس قدر کلام کو طول دینا چاہیئے"۔ اسی طرح جو موقع اختصار ہے وہاں اگر سلسلۂ کلام دراز کیا جائے تو ویسا ہی مخل بلاغت ہوگا جیسا محل اطناب میں ایجاز۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ (تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے) اس مختصر عبارت میں الفاظ کی سلاست اور معانی کی کثرت کمال بلاغت ہے۔ اس قدر معانی کثیرہ پر حاوی عبارت اس سے زیادہ مختصر الفاظ کے سلاست کے ساتھ ناممکن ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایسے غیر مانوس الفاظ لائے جائیں جن سے تھوڑے الفاظ میں معانی

کثیرہ مخفی ہوں لیکن بشیتر ایسے الفاظ ثقیل اور مخل فصاحت ہوا کرتے ہیں۔ یا کچھ اجزاء کا حذف ہوتا ہی۔ ان عیوب سے پاک کوئی عبارت اس سے زیادہ مختصر اور اس سے زیادہ معانی کو گھیرنے والی ناممکن ہی۔ عرب اس عبارت کے اختصار پر فخر کرتے تھے کہ القتل انفی للقتل (قتل ہی قتل کو خوب روکتا ہی) لیکن حقیقت یہ ہی کہ القتل انفی للقتل سے کلام پاک بدرجہا بہتر ہی۔ اوّل یہ کہ کلام پاک (القصاص حیٰوۃ) میں فقط دو ہی لفظ ہیں اور مقولۂ عرب میں چار۔ دوسرے یہ کہ مقولۂ عرب میں تکرار لفظ ہی جو مخل فصاحت ہی اور یہاں تکرار نہیں۔ تیسرے یہ کہ مقولۂ عرب اظہار مدعا میں ناقص ہی۔ ہر قتل مانع قتل نہیں۔ بلکہ بعض قتل موجب فتنۂ عظیمہ اور بڑی خونریزی کا سبب ہوتے ہیں۔ صرف وہی قتل امن کا سبب ہی جو بغرض قصاص ہو۔ پھر حیٰوۃ کے لفظ نے جو خوبی پیدا کی اور اس کے اندر جس قدر معانی داخل ہیں اُن کو انفی پورا نہیں کر سکتا۔ کمال اختصار یہی ہے کہ معانی کثیرہ کو اُس سے کم الفاظ ادا کریں۔ یہاں حیٰوۃ سے اس امر کی جانب اشارہ ہی کہ ترک قصاص سے ہر شخص کی زندگی کا غیر محفوظ ہونا ایسا یقینی ہے کہ اُس کو موت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ نوع انسان کی ہلاکت کا خطرہ قطعی ہی۔ آیندہ یقینی طور پر ہونے والی بات کو کبھی بصیغہ حاضر بیان کرتے ہیں لہذا عدم قصاص میں جو ہلاکت آیندہ ہونے والی ہی اُس کو ہم زمانہ موجودہ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہلاکت موجود ہی۔ اب قصاص کی صورت میں اس موجودہ موت کا چونکہ خطرہ نہیں ہی اس کو حیات سے

تعبیر کرسکتے ہیں اس لئے کہ موت سے کسی کو بچانا حقیقتاً اُس کو زندہ کرنا ہی۔ اس مضمون کو
اس سے زیادہ مختصر اور خوبصورت الفاظ میں ادا کرنا طاقت بشری سے باہر ہی۔
اسی طرح ذہین اور غبی سے گفتگو میں باعتبار اُن کی ذکاوت کے اور بلادت کے
کلام میں امتیاز کرنا۔ ذہین سے کلام کرنے میں تشریح اور تصریح زائد خلاف بلاغت
ہی۔ ذہین کا وقت ضائع کرنا ہی۔ بخلاف غبی کے جس سے گفتگو میں تھوڑے الفاظ
میں معانی کثیرہ کو حاوی جملہ استعمال کرنا خلاف بلاغت ہی۔ غبی سے گفتگو میں
موقع یہ چاہتا ہی کہ الفاظ بالکل صاف ہوں، عبارت بہت سلیس ہو۔ ادائے مطلب
میں کسی قسم کی پیچیدگی استعارات و کنایات کے لانے سے پیدا نہ ہو۔ ذہن غبی
معانی لطیفہ اور اشارات خفیہ کے بار کو برداشت نہیں کرسکتا۔ انھیں مواقع اور
محل کا لحاظ کرکے کلام کو ترتیب دینا بلاغت ہی۔ اسی طرح تمام کلمات جو ایک
کلام کی ترتیب میں واقع ہوتے ہیں اُن میں سے ہر ایک کو دوسرے کے ساتھ
ایک نسبت اور ربط معنوی ہوتا ہی جو دوسرے کلمہ کو اُس محل میں حاصل نہیں
مثلاً ایک فعل ہی جو بصورت شرط جملہ کے اندر واقع ہی اُس کو حروف شرط کے
ساتھ جو تعلق و ارتباط ہی اُس کو دوسرے فعل کے ساتھ نہیں ہی۔ یا جو حرف شرط اُس کو
فعل ماضی کے ساتھ ربط ہی وہ ربط فعل مضارع کے ساتھ نہیں ہی اسی پر اُن تمام
حالات الفاظ کو جو جملہ کے اندر باخود باہم مرتبط ہونے سے پیدا ہوتے ہیں قیاس
کرنا چاہیئے۔ کہیں کسی لفظ کو مقدم لانا خوبی پیدا کرتا ہے اور کہیں اُسی کو موخر کرنا

زینتِ کلام کا موجب ہوتا ہی۔ حقیقتاً یہ مواقع مناسبہ کا لحاظ و اعتبار ہے جس پر کلام کے حسن و قبح کا دار و مدار ہے اور یہی وہ خصوصیات ہیں جن کے لحاظ سے کلام دلوں کو مسحور کر لیتا ہی۔ اِنَّ مِنَ البَیَانِ لَسِحرًا۔ لیکن اگر یہ لحاظ اور مقتضیات محل و موقع کا امتیاز اُٹھا دیا جائے تو کلام کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی مقتضیات محل کا لحاظ کرنا ایک ملکہ ہی جس کا تعلّق متکلم کے ذکاوت اور صحت مذاق سے ہے کہ وہ اپنے مدعا کو جسے الفاظ و عبارت میں ادا کرنا چاہتا ہی کن لفظوں میں ادا کرے لیکن اسی کے ساتھ اگر کسی شخص کو فصحاء کے کلام پر اطلاع ہو تو اُس کے تتبع سے بھی ایک قوت پیدا ہو سکتی ہی جس سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہی کبھی ایسا بھی ہوتا ہی کہ صنائع لفظی و معنوی سے کلام خوشنما ہو جاتا ہی لیکن یہ بہت ممکن ہی کہ وہ بلیغ نہ ہو اس لئے کہ بلاغت کا تعلق معانی سے ہے نہ کہ الفاظ سے۔ بلاغت کے اصول و قواعد کچھ تو عقلی ہیں جن کا تعلق ہر زبان کے ساتھ برابر ہی اور اُس کی تعلیم فطرت کرتی ہی اور کچھ ہر زبان کے ساتھ مخصوص ہیں۔

یہ جزئیات متنوعہ ہیں جو تتبع اور وسعت نظر اور وفور مطالعۂ زبان سے معلومات میں ترقی کرتے ہیں۔ ہر زبان میں ان کی خصوصیات جداگانہ ہیں جو کسی قاعدہ میں منضبط نہیں ہو سکتیں۔ متاخرین نے بلاغت کی تعریف میں فصاحت الفاظ کی قید بڑھائی ہی لیکن کبھی اس کے خلاف بھی ہوتا ہی۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض جگہ جہاں کوئی بھونڈا پن دکھلانا ہوتا ہے وہاں بھدّا اور غیر فصیح لفظ حسن کلام کو دوبالا

کر دیتا ہی محاورات اُردو میں تو بکثرت ہیں۔ عربی زبان میں بھی ایسا دیکھا گیا ہی۔ یہ بحث غیر ضروری ہی اس لئے میں چھوڑتا ہوں۔ فیثاغورث نے ابتداءً فصاحت الفاظ کی قید کو تعریف بلاغت میں شامل کیا تھا۔ لیکن سقراط نے اس کو اہم نہیں سمجھا ہے پہلے میں لکھ چکا ہوں کہ فن بلاغت کی تدوین ارسطو کے زمانہ سے ہوئی۔ ارسطو سے پہلے یہ فن محض عدالتی اور سیاسی امور کے لئے مخصوص تھا اور محض چند قواعد تھے جو بطور اصول موضوعہ کام میں لائے جاتے تھے۔ سکندر کے زمانہ میں جس طرح علم نحو کی تدوین ہوئی اُسی طرح دور ارسطو اس فن کے لئے یادگار ہے۔ اس کی ابتدائی حالت کا اندازہ سقراط کی تقریر سے ہوتا ہی جس کو میں یہاں اس مضمون کو واضح کرنے کے لئے نقل کرتا ہوں اور جو بلاغت کے بچپن کی تصویر ہی۔

بلاغت کی نسبت سقراط کی تقریر

تقریر کی خوبی کے لئے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ مقرر کا ضمیر اُس موضوع کی صداقت سے آگاہ ہو جس پر وہ تقریر کرنا چاہتا ہے۔ ایک مقرر جو نیک و بد میں امتیاز کرنے سے قاصر ہے اُس کی تقریر دوسروں پر کیا اثر ڈال سکتی ہی۔ دوسرے جو شخص حقیقت اشیاء سے ناواقف ہی وہ اُس فن سے محض بے بہرہ ہی کہ اپنے سامعین کی رہبری کسی شے سے اُس کے ضد کی طرف درمیانی متشابہات کو طے کرکے کرے یا خود کسی مغالطہ میں گرفتار نہ ہو جائے۔ پس جو شخص فن بلاغت کی تکمیل کرنا چاہتا ہے اُس کو لازم ہی کہ پہلے اشیا کی با اصول تقسیم کرکے اُن اجزاء سے پوری

پوری واقفیت حاصل کرے جن کے بارے میں لوگ شک و شبہ میں ہیں میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد اگر اُس کو کسی خاص واقعہ سے واسطہ پڑے تو وہ اُس وقت تاریکی میں نہ ہوگا بلکہ اُس کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ جس شئے کے متعلق اُس کو تقریر کرنا ہے وہ کس طبقہ کی ہے (یعنی مشکوک یا واضح) کسی مدعا کے اظہار میں دو اصول مقدم ہیں جن کا جان لینا ضروری ہے ایک تو یہ کہ اُس کی باقاعدہ تنظیم مثل ایک ذی روح کے ہونی چاہیئے جس میں جسم ہو یعنی مضمون کا وسطی حصہ یہ نہیں کہ بے سر و پا (یعنی بغیر تمہید و خاتمہ) جو کچھ منہ میں آوے کہہ دیا جاوے جس طرح سے کہ اجزائے جسمانی میں تناسب ہوتا ہے بالکل یہی تناسب تقریر کے ایک جزو کو دوسرے جزو کے ساتھ اور تمام اجزاء کو مضمون کے ساتھ بحیثیت مجموعی ہونا چاہیئے۔ دوسرا اصول اشیاء کو مختلف درجات میں تقسیم کر لینا ہے مگر اُن کو فطری جوڑ سے علیحدہ کرنا چاہیئے یہ نہیں کہ جہاں سے چاہا توڑ مروڑ ڈالا۔ سب سے پہلے کسی مضمون کے ادا کے لئے تمہید ہونی چاہیئے جو مثالوں سے واضح کی جائے۔ تھیوڈورس نے یہ بھی بتلا دیا ہے کہ کسی مضمون کے اصلاح کی تکمیل کیونکر کرنی چاہیئے پیرین اور اپولونیوس فن تقریر میں مخفی اشارات اور ضمنی توصیف کے موجد ہوئے ہیں۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اُس نے ہجو ملیح بھی لکھی اور اُس کو سہولت حفظ کے لئے نظم کر لیا تھا۔ گارجیس اور ٹیسس اس سلسلہ میں قابل ذکر ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو الفاظ کے زور سے چھوٹی

چیز کو بڑی اور بڑی چیز کو چھوٹی نئی چیز کو پرانی اور پرانی کو نئی بنا کر دکھا دیتے تھے۔
ان کا خیال تھا کہ ظنیات بمقابلہ قطعیات کے زیادہ قابل وقعت ہیں۔ انھوں نے
تمام مباحث پر اختصار اور طوالت سے کام لینے کا طریقہ ایجاد کیا تھا ایک مرتبہ
پروڈیکس ان تمام ایجادات کو سن کر ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ صرف میں نے ہی
اس فن کا اکتشاف کیا ہے اور وہ یہ کہ تقریر نہ تو ضرورت سے زیادہ طویل ہو اور
نہ محض مختصر بلکہ طوالت کا درجہ معقول ہونا چاہیئے۔ فیثاغورث بھی اس فن میں
فصاحت اور صحت الفاظ اور دیگر بہت سے عمدہ باتوں کا موجد ہوا ہے لیکن رولا
دینے والی تقریروں میں جن کے اثر سے لوگوں کے دلوں میں ضعف کے ساتھ
ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ان پر تاسف کرنے لگتے ہیں کالیڈونیا کا
مقرر گوئے سبقت لے گیا ہے۔ اس کو اس بات میں بڑا ملکہ ہے اگر وہ چاہے تو بڑی
بڑی جماعتوں کو مشتعل کر دے اور پھر اپنی سحر بیانی سے ان کے غصہ کی آگ کو آن
واحد میں سرد کر دے۔ لیکن یہ سب کے سب تقریر کے نتیجہ کے متعلق بالکل متفق الرائے
ہیں جس کو بعض لوگ اعادہ مختصر کہتے ہیں اور بعض کسی اور نام سے تعبیر کرتے ہیں
لیکن محض یہ صفت فن کی پوری واقفیت کے لئے کافی نہیں ہے مثلاً کوئی تم سے
اگر یہ کہے کہ مجھکو وہ دوائیں معلوم ہیں جن سے انسان میں گرمی یا سردی پہنچائی
جاتی ہے وغیرہ وغیرہ اس وجہ سے میں ایک طبیب ہوں اور دوسروں کو طبیب
بنا سکتا ہوں تو کیا تم اُسے طبیب مان لوگے؟ ہرگز نہیں جب تک کہ وہ یہ نہ بتائے

کہ آیا وہ یہ بھی جانتا ہے کہ دوا کس کو کہتے ہیں اور کب اور کتنی دینی چاہیے لیکن اگر
وہ یہ کہدے کہ نہیں یہ باتیں میں مطلق نہیں جانتا البتہ یہ جانتا ہوں کہ اگر مجھسے
کوئی شخص یہ باتیں سیکھ لے تو وہ سب کچھ کر سکے گا تو میں ایسے آدمی کو یہی کہوں گا
کہ اس کا سر پھر گیا ہے کہیں کسی کتاب میں اس نے کچھ دیکھ لیا ہے یا کوئی دوا
اُس کے ہاتھ لگ گئی ہے اور طبیب بن بیٹھا بالکل اسی طرح اگر کوئی ماہر فن تقریر
کے پاس جا کر یہ کہے کہ میں ذرا سی بات پر بڑی لمبی چوڑی تقریر کر سکتا ہوں اور
بڑے بڑے اہم معاملات پر مختصر تقریریں کر سکتا ہوں مجھ کو یہ بھی معلوم ہے کہ
پراثر تقریریں کیسے کی جاتی ہیں اور میں ان سب باتوں میں ماہر ہونے کی وجہ سے
لوگوں کو ٹریجیڈی (Tragedy) لکھنا سکھا سکتا ہوں تو اگر اس کا یہ خیال
ہے کہ ٹریجیڈی (Tragedy) اور ان تمام جزئیات میں (جن کا ذکر ابھی ہوا)
ربط و تناسب پیدا کرنا دو علیحدہ چیزیں ہیں تو لوگ اُس کو سُن کر ہنس دیں گے
جس طرح کہ ایک ماہر موسیقی کے پاس اگر کوئی شخص جا کر یہ کہے کہ میں سب سے اونچا اور
سب سے نیچا سُر نکالنا جانتا ہوں تو وہ نہایت نرمی سے یہی کہے گا کہ میاں تم ابھی پکے
گانے والے نہیں ہو بلکہ صرف ابتدائی باتیں جانتے ہو۔ اسی طرح ماہر فن تقریر بھی
ایسے آدمی کی گفتگو سُن کر یہی کہیں گے کہ تم ابھی صرف مبادیات فن سے واقف
ہو نفس فن میں تم کو دخل نہیں ہے۔ اگر ہماری اور تمہاری باتیں اڈراسٹس اور
پرکلیس سینن تو وہ بھی کہیں گے کہ دیکھو یہ دونوں خطابت سے ناواقف ہونے کی وجہ

فن بلاغت کی حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ مگر محض مبادی کے جاننے سے یہ سمجھتے ہیں
کہ ہم واقف کاران فن سے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہر فن میں اس بات کی ضرورت
ہے کہ نیچر سے بحث اور اُس پر غور وخوض کیا جائے اور یہ خصوصیت پر لکلس میں
خداداد قابلیتوں کے علاوہ پائی جاتی ہیں دیکھو فن بلاغت فن جراحی کی طرح
ہے جس طرح موخرالذکر میں جسم کو دوا اور غذا کے ذریعہ سے سائنٹیفک طریقہ
پر صحت و قوت پہنچائی جاسکتی ہے نہ کہ محض مشق و پامال طریقہ عمل سے اسی طرح
مقدم الذکر میں روح کو بھی مناسب طریقہ سے امور مطلوبہ باور کرائے جاسکتے ہیں
یہ تو بالکل واضح ہے کہ روح کی حقیقت کا علم بغیر فطرت انسانی کے علم کے محال ہے
جب کسی شے کے نیچر سے بحث کرنی ہو تو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا ہمارا
موضوع بحث مفرد ہے یا مرکب اگر مفرد ہے تو اس کا عمل کیا ہوتا ہے یا وہ کیونکر کسی
دوسری شے کا معمول بنتا ہے اگر مفرد نہیں بلکہ اُس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں تو اُن
سب کا استقصا کرکے ہر ایک صورت کے عمل اور اُس کے معمول ہونے کو دیکھنا چاہیئے
صرف اسی طریقہ کو ہم کسی شے کے نیچر کا مطالعہ کہتے ہیں لہذا لازم ہے کہ جو شخص
فن بلاغت کی تعلیم دے وہ سب سے پہلے اُس شے کی حقیقت کو منکشف کردے جو
الفاظ کا مخاطب صحیح قرار پائے اور وہ کیا ہے؟ روح۔ اتنی بات تو واضح ہوگئی کہ
جو شخص فن بلاغت کی تعلیم دینا چاہتا ہے وہ
(۱) روح کی حقیقت کو بے حجاب کردے یعنی یہ بتلادے کہ وہ مفرد اور واحد ہے

یا جسم کی طرح سے مختلف صورتیں رکھتی ہے۔

(۲) دوسرے اس کو یہ بتانا چاہیئے کہ اُس کا عمل کیا ہی اور وہ کس سمت کو رہبری کرتی ہی اور وہ خود کیونکر معمول ہوا کرتی ہے۔

(۳) پھر وہ ارواح اور تقریروں کو مختلف درجات میں تقسیم کرکے یہ بتائے گا کہ کونسی تقریر کس درجہ کے لئے موزوں ہی اور خاص قسم کی روحیں کس قسم کی تقریر سے کیوں متاثر ہوتی ہیں اور اُسی تقریر سے دوسری کیوں نہیں اثر پذیر ہوا کرتیں

چونکہ تقریر کی غرض وغایت روح کو کسی خاص جانب ترغیب دلانا ہی پس جو شخص کہ مقرر بننا چاہتا ہے اُس کو لازم ہے کہ روح کی مختلف کیفیات سے آگاہ ہو اور چونکہ اس کی ہزارہا قسمیں ہیں اسی لئے انسان کی بھی مختلف قسمیں قرار پائیں گی

اب تقریر کی بھی مختلف اقسام ہیں اس لئے ایک خاص قسم کے انسانوں پر کسی خاص وجہ سے ایک خاص قسم کی تقریر کا اثر پڑتا ہے وہ متاثر ہو کر اپنے خیالات وافعال کو اُسی سانچہ میں ڈھال لیتی ہیں اور دوسرے لوگوں پر یہ اثر نہیں پڑتا پس اس فن کے طالب کو چاہیئے کہ ان مختلف اقسام سے واقفیت پیدا کرے اور پھر اپنے آپ کو اس قابل بنائے کہ وہ ان تمام اقسام کو زندگی کی کشاکش میں اطلاع حاصل کرے تب البتہ وہ کہہ سکتا ہی کہ تعلیم کچھ مفید ہوئی جب وہ اتنا سیکھ لے کہ کس قسم کا آدمی کس قسم کی تقریر سے اثر پذیر ہوتا ہی اور کبھی ایسے شخص سے دوچار ہو جائے تو وہ پہچان لے اور اپنے آپ کو باور کرالے کہ ایسے ہی شخص کی نسبت